R. No. 2104/57

Regd. No. 522

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

Telephone No. 30

Telegrams "ANJUMAN"

ہماری زبان

جلد ۲۲ - شمارہ ۲ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۸ جنوری سنہ ۱۹۶۳ء

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

موجودہ حالات اور ادیب

اقبال نے جب فخر و ناز سے کہا تھا:-

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

تو وہ دراصل اس اعتماد کا اظہار کر رہے تھے جو صدیوں سے ہمارے قومی مزاج کا حصہ رہا ہے، لیکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے حالات کتنی تیزی سے بدل گئے ہیں۔ شمالی ہندوستان کی آہنی دیوار آتش و بارود کی زد میں آچکی ہے۔ چین کا جارحانہ حملہ محض سرحدوں کا جھگڑا نہیں، یہ ہمارے انداز فکر اور نظام زندگی کے لئے چیلنج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ملک کا ذرہ ذرہ بے چینی کی تصویر بنا ہوا ہے اور وطن دوستی کی لہر اتنی اونچی اٹھ چکی ہے کہ لسانی، مذہبی اور علاقائی اختلافات کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بہت پیچھے ڈوب کے رہ گئے ہیں۔ برسوں کی جد و جہد اور قربانیوں کے بعد جو آزادی حاصل ہوئی تھی، لوگ اس کی قدر و قیمت کا احساس کرنے لگے ہیں اور ملک میں قومی بیداری اور جوش و ولولے کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ جسے دیکھئے وطن کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہے۔ چنانچہ فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں ادیب اور شاعر کا فرض کیا ہے؟ کیا اسے بندوق ہاتھ میں لے کر میدان کارزار میں کود جانا چاہئے یا داخلیت کے مرمریں گنبد میں بند تخیل کی تانیں اڑاتے رہنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک شہری کی حیثیت سے وہ ملک کی حفاظت کے لئے کوئی بھی کام ہاتھ میں لے سکتا ہے، حتیٰ کہ شہادت کے "منصب بلند" تک پہنچنے سے بھی اسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ شاعر اور ادیب کی حیثیت سے اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ ایک بار کسی نے اقبال سے پوچھا کہ آپ کے کلام سے حرکت و عمل کا پیغام ملتا ہے اور ہمتیں بلند ہوتی ہیں لیکن خود آپ قومی کاموں میں عملی طور پر کوئی حصہ نہیں لیتے؟ اقبال نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ اگر قوال بھی وجد میں آ جائے تو محفل کا کیا حال ہوگا؟ اس جواب سے اتنی بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ ادب زندگی کی تخیلی ترجمانی ہے۔ شاعر علم اٹھاتا ہے، وہ صفیں آراستہ کرتا ہے، اس کی اپیل ذہن و جذبے سے ہے یا دوسرے الفاظ میں ان انسانی قوتوں سے جنھیں باطنی قوتیں کہا جاتا ہے۔ غرض جب ادب کی دنیا عمل کی دنیا نہیں تو یہ نکتہ غور طلب ہے کہ کیا ادیب و شاعر خارجی زندگی کے تقاضوں سے بے نیاز رہ سکتے ہیں اور اگر نہیں رہ سکتے تو ان ذمہ داریوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو ملک و قوم کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ اس سوال کا تعلق دراصل ادب کی نوعیت کے اس بنیادی مسئلے سے ہے جس پر "ادب اور افادیت" یا "ادب اور مقصدیت" کے عنوانات سے لمبی لمبی بحثیں کی جاتی ہیں جو اکثر ادبی کم اور سیاسی زیادہ ہوتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم بھی ان بھول بھلیوں میں پڑ کر خواہ مخواہ نظریاتی بے یقینی کی راہوں میں بھٹک جائیں۔ بہتر یہی ہے کہ ادب کے بارے میں بعض اصولی باتوں کی وضاحت کر دی جائے اور پھر ان کی روشنی میں ہم اپنے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

ادب کے متعلق بنیادی بات یہ ہے کہ یہ وہ پودا ہے جو آزاد فضاؤں میں لہلہاتا ہے اور بادِ باصر کی زہریلی ہواؤں میں خواہ وہ کتنی نرم خرام ہوں، پنپ نہیں سکتا۔ ادیب اپنی تخلیق کے لئے ریاست کا مرہون منت ہے، نہ سماج کا اور نہ کسی دوسرے فرد کا۔ چنانچہ اسے نہ تو ریاست کی دربارداری پر مجبور کیا جا سکتا ہے نہ کسی فرد اور طبقے کی پابندی پر۔ ادب سب سے پہلے ادب ہے اور پھر کچھ اور۔ یعنی پہلے وہ اپنی حیثیت منواتا ہے اور پھر مسائل بنانا پوچھتا ہے۔ ادب کی واحد کسوٹی صداقت ہے۔ اس پر کھرا اترنے کے لئے ادیب کو اپنے احساسات اور تجربات کی وادی میں

سینے پر گولی چلنا پڑتا ہے، مصلحتوں کے کانٹے ہٹانے پڑتے ہیں اور انعام کے لالچ اور سزا کے خوف سے بلند و بے نیاز ہو کر ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا پڑتا ہے۔ ادیب کا سر ہر دور میں اونچا اسی لئے رہا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کی راہ سے ہٹا نہیں سکتی۔ ریاست یا سیاسی نعرے باز اس کے ضمیر کو خرید نہیں سکتے۔ وہ نقیب ہے حق و صداقت کا اور اس کی تخلیقی کاوشوں میں روشنی آتی ہی اس انداز اظہار خیال سے ہے۔ ادب فنون لطیفہ میں سے ہے اور فنون لطیفہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا سب سے بڑا مقصد حسن و مسرت ہے لیکن اگر حسن و مسرت سے مراد محض تفریح اور ذہنی انبساط ہے جس کی تصدیق موسیقی، رقص، مصوری وغیرہ فنون سے ہوتی ہے تو ادب کے اعلیٰ منصب کو فراموش کرنا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ موسیقی یا رقص کی بہ نسبت ادب کا تعلق زندگی اور اس کے مسائل سے کہیں زیادہ اساسی اور اصلی ہے۔ وہ اس لئے کہ ادب فنون لطیفہ کا عطر ہے اور اس لحاظ سے اس کے تقاضے بھی نسبتاً ہمہ گیر ہیں۔ خود ہندوستان کے قدیم ماہرین جمالیات کی نظر میں ادب کے مقاصد کا جو تصور تھا اس میں حسن و مسرت کو حق و صداقت سے الگ نہیں قرار دیا گیا۔ "ستیم، شوم، سندرم" سے مراد ہے "صداقت، عظمت اور حسن"۔ جس طرح حق کا تصور خیر سے وابستہ ہے، حسن بھی صداقت کے بغیر بے معنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا [illegible] ہے کہ [illegible] و مسرت کا تصور بغیر حق، خیر اور صداقت کے سطحی اور بے [illegible] ہے۔ [illegible] زندگی کے لازوال گیت اسی وقت گا سکتا ہے جب زندگی سے اس کا رشتہ سچائی اور صداقت کا ہو اور ایسا تبھی ہو سکتا ہے جب اس کے ضمیر پر کوئی پابندی نہ ہو اور وہ اپنے احساسات اور تجربات کے اظہار میں پوری طرح آزاد ہو۔ سارتر کا قول ہے کہ ادیب صرف ادب کے سامنے جواب دہ ہے اور ادب کا سب سے بڑا تقاضا غور و فکر کی آزادی اور حق و صداقت کی پاسداری ہے۔ چنانچہ آزادانہ طور پر جب کوئی ادیب حق و باطل اور تعمیر و تخریب کی آویزش و پیکار پر غور کرتا ہے تو وہ فطری طور پر خود کو جنگ کے مقابلے میں امن، غلامی کے مقابلے میں آزادی اور بے انصافی کے مقابلے میں انصاف کی حمایت کے لئے سینہ سپر پاتا ہے۔ چین کے شرمناک حملے نے ادیب کو ایک بار پھر ان مسائل پر سوچنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہندوستان کے اس ہمسائے نے دوستی کی آڑ میں بدترین دشمنی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے بیسویں صدی کے اس دور میں جب ایشیا اور افریقہ میں چاروں طرف آزادی کی دھوپ چمکنے لگی ہے اور سامراجیت کے عفریت کو دفنایا جا رہا ہے ایک بار پھر سامراجیت کے علاقائی حرص و ہوس کی یاد تازہ کر دی ہے۔ چند برس کی بات ہے کہ اس پڑوسی ملک میں ترقی پسند قوتوں کی فتح و کامیابی پر اردو ادیبوں اور شاعروں کے دل بھی مسرت سے بھر گئے تھے لیکن سرحدوں کو بہانہ بنا کر آج اسی ملک کا وحشت پرستی کا مظاہرہ کرنا ہم سب کے لئے کتنا اذیت بخش ہے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ نام نہاد ترقی پسند ملک کے قول و فعل اور کردار و گفتار میں کتنا زبردست تضاد ہے اور اس نے دغابازی، فریب دہی، مکاری، دروغ گوئی اور بے ایمانی کے پرانے تمام ریکارڈ کس خوبی سے مات کئے ہیں۔ کذب و افترا، ظلم بلند کرنے اور صداقتوں کو پاؤں تلے روندنے میں تو وہ فاشسٹ جابروں سے بھی بازی لے گیا ہے۔ بظاہر وہ ہمارے عوام سے ہمدردی کا دم بھرتا ہے لیکن [illegible] ہماری جمہوریت کا گلا گھونٹنا چاہتا ہے۔ فریب دہی اور حقائق پر پردہ ڈالنے کی

اس سے زیادہ شرمناک کوشش اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے برسوں کی تیاری کے بعد لاکھوں کی تعداد میں اپنی فوجوں کو غاصبانہ کارروائی کے لئے جمع کیا ہے اور ہمالیہ کے برف پوش سلسلوں کو شعلہ زاروں میں بدل دیا ہے لیکن دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ سرحد کے محض حفاظتی کارروائی کر رہے ہیں۔ صداقت کیا ہے؟ یہ ہر شخص جانتا ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات حق و صداقت کو بھی اضافی قرار دیں اور یہ دعویٰ کریں کہ حق و صداقت کے لئے بھی کسوٹی صد معروضی نقطۂ نظر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے جواب میں عرض کرنا ہوگا کہ جب معاملہ وطن پر حملے کا ہو طاقت و تشدد سے مطالبات منوانے کا ہو، دھوکے فریب دہی اور مکاری یا آزادی فکر و نظر کے تصورات کو فنا کرنے کا ہو تو حق و صداقت کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ چند ضمیر فروشوں اور غداروں کی بات دوسری ہے ان سے قطع نظر آج ملک کا ہر ذی شعور انسان جانتا ہے کہ چین کا حملہ محض ہماری سالمیت پر حملہ نہیں بلکہ یہ کوشش ہے ہمارے خوابوں کو پاش پاش کرنے کی، جن کی تعبیر ہم نئے ہندوستان کے تعمیری کاموں میں دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ حملہ ہے ہمارے طرز زندگی پر، ہمارے جمہوری نظام پر، فرد کی عظمت اور آزادی فکر و نظر کی ان قدروں پر جو ہمیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ ظاہر ہے کہ اردو ادیب و شاعر ان حالات میں خاموش نہیں رہ سکتے۔ وہ شریفانہ اقدار کی پامالی پر رنجیدہ ہیں۔ ضمیر کی آزادی چونکہ انھیں ہر قسم کی بے انصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر اکساتی ہے، وہ چین کی غاصبانہ اور جابرانہ سرگرمیوں کی مذمت کرنے پر مجبور ہیں اور آزادی و سالمیت کی حفاظت کے لئے مستعد ہو چکے ہیں۔ اتنی بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ ادب کی دنیا دل و دماغ اور روح کی دنیا ہے۔ ادیب کی تلوار اس کا قلم ہے۔ وہ جسمانی وار نہیں کرتا لیکن جذبے میں ایسی آگ ضرور لگا دیتا ہے جس سے تلوار کے وار میں طاقت آ جاتی ہے اور ارادے میں آہن و فولاد کی سی مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض آج کا ادیب سستے نشے یا سطحی مسرت کے نام پر جنگ، بربادی، تباہی اور غلامی سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ چنانچہ فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ان مسائل پر اظہار خیال کا پورا حق حاصل ہے۔ اس نے اگر ضمیر کی آواز کو دبایا یا کسی مصلحت کی بنا پر ظلم و تشدد، مکاری اور کذب و افترا کا پردہ چاک کیا تو سمجھئے کہ اس نے اپنے فرض سے روگردانی کی اور ادب کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا۔ ادیب یا شاعر کے انداز فکر میں اگر حکومت وقت یا کسی سیاسی پارٹی سے اختلاف لازم آئے تو اس کے اظہار میں بھی وہ پوری طرح آزاد ہے۔ اسی بنا پر اسے "دیدۂ بینائے قوم" کہا گیا ہے۔ قومی شعور کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب کسی مخصوص نقطۂ نظر کی غلامی کو اپنا شعار بنا لے۔ ایسا کر لیا جائے تو پھر ادب اور سیاست میں یا ادب اور صحافت میں فرق ہی کیا ہے۔ ترقی کا راستہ صرف صحت مندانہ تنقید کا راستہ ہے۔ ادیب کو ایک سچے محب وطن کی حیثیت سے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خیالات کا پوری آزادی سے اظہار کر سکے اور اپنے ملک سے اپنی غیر مشروط وفاداری کا اعلان کرنے اور اس کی سالمیت اور حریت کے پیغام کو عام کرنے میں بے باک اور نڈر ہو۔ (باقی صـ ۔۔۔ پر)

ہمالہ کی پاسبانی کے لئے ہمالہ کا سا عزم درکار ہے
آل احمد سرور

ہماری زبان

۸ جنوری ۱۹۹۳ء

ذمّے داری کس کی ہے؟

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اترپردیش میں اُن طلبہ کی تعداد کم ہوئی ہے جو ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعہ سے حاصل کر رہے ہیں۔ جب ہماری ریاستی شاخ کے وفد نے کمشنر سے جے پور میں ملاقات کی تو ایسی بہت سی مثالیں سامنے آئیں جن سے مقامی افسروں کی کوتاہی ثابت ہوئی حالانکہ ریاستی حکومت کے احکام واضح تھے اور ضروری شرطوں کے پورے ہونے کے بعد مقامی افسروں کا فرض تھا کہ وہ اُردو کے ذریعہ سے تعلیم کا انتظام کرتے۔ جب شری سی بی گپتا نے کانپور کی کل ہند اُردو کانفرنس میں تقریر کی، تو اُنھوں نے ریاستی حکومت کی لسانی اقلیتوں کے مسائل سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ نیچے کی منزل پر افسروں سے کوتاہیاں ضرور ہوئی ہیں۔ اس لئے یہ بات خاصی ذمّے داری سے کہی جا سکتی ہے کہ مقامی افسر اُردو کے ذریعہ سے ابتدائی تعلیم کا انتظام کرنے میں ٹال مٹول کرتے ہیں اور اس وجہ سے مطالبہ کرنے والوں کی دل شکنی ہوتی ہے اور وہ دو چار دفعہ ہاتھ پیر مارنے کے بعد تھک کر اور مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ہمارا فرض ہے کہ اس صورت حال پر غور کریں اور دیکھیں کہ مقامی افسر ایسا کیوں کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دفتروں اور اداروں میں اس وقت خاصی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اُردو کے مسئلے پر حکومت کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے اور باوجود واضح احکام کے اس سلسلے میں ٹال مٹول کرتے ہیں۔ وہ اس لئے ایسا کر سکتے ہیں کہ اُن سے اس پر باز پرس نہیں ہوتی۔ یہ تو کبھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اعلیٰ درجے کے حکام بے بس ہیں اور ریاستی حکومت ضلعوں اور قصبوں میں اپنی بات نہیں منوا سکتی۔ اس لئے ثابت یہ ہوتا ہے کہ مقامی افسروں کو یقین ہے کہ اوپر والے لوگ اس معاملے میں صرف خانہ پری چاہتے ہیں اور اُن کے احکام کو نہ ماننے میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس طرح نچلی سطح پر احکام کی پابندی نہ ہونے کی ذمّے داری بھی اعلیٰ افسروں اور ریاستی حکومتوں پر عاید ہوتی ہے اور اُنھیں صاف طور پر ذمے داری کو محسوس کرنا چاہیے اور مقامی افسروں سے حکومت کی پالیسی پر عمل کرانا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ اصول اور عمل میں انسانی کمزوریوں کی وجہ سے کچھ فرق پڑ ہی جاتا ہے مثلاً اگر احکام کی اسّی یا نوّے فی صدی پابندی ہو تو ہم اس کو مجبوری سمجھ کر نظر انداز کرنے پر شاید تیار ہو جائیں مگر جب ہم اچھی طرح دیکھ رہے ہیں کہ دس فی صدی بھی عمل نہیں ہے تو ہم کیسے خاموش ہو جائیں۔ احکام پر عمل کرنے یا قانون کی پابندی نہ کرنے یا حکومت کی خواہشات کا احترام نہ کرنے کی بات صرف اُردو پر ختم نہیں ہو جاتی، اس طرح سماج میں ایک زہر پھیلتا ہے۔ اس سے حکومت اور سماج دونوں کمزور ہوتے ہیں۔ اس سے قوم کے ڈسپلن پر اثر پڑتا ہے۔ جب کچھ افسر اُردو کے سلسلے میں حکومت کے احکام پر عمل نہیں کریں گے اور اُن کا کچھ نہیں بگڑے گا تو پھر کچھ اور افسر لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے سلسلے میں تفریق برتیں گے، کچھ سماج کے دوسرے مجرموں کے ساتھ رعایت کریں گے، کچھ ذات، برادری، علاقے، عہدے، پارٹی اور مذہب کی بنیاد پر تفریق کریں گے۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس سے ملک کمزور ہوگا۔ آزادی کے بعد ہماری ترقی کی رفتار دراصل اس وجہ سے سُست رہی ہے کہ ہم جن اصولوں پر فخر کرتے ہیں اور جن کے تسلیم کرنے کی بار بار قسم کھاتے ہیں، اُن پر قرار واقعی عمل نہیں کرا سکتے۔ یقیناً اس سلسلے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ کچھ سیاست داں چناؤ کے زمانے میں ہر قسم کے وعدے کر لیتے ہیں، کچھ وزیر سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے بہت سی باتوں کا اعلان کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ وعدے کرنے اور اعلان کرنے کے بعد اُن کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے ماتحتوں سے اُس پر عمل کرائیں۔ اگر دستور میں یہ صراحت ہے کہ ہر ریاست کی حکومت ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے کی پوری کوشش کرے گی تو یہ واقعی پوری کوشش ہونی چاہیے، اور اس کوشش کا اظہار عملی دنیا میں ہونا چاہیے۔ محض احکام جاری کر دینے اور خاموش بیٹھ جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم اس بات کو اس لئے اہمیت دے رہے ہیں کہ اگر اُردو والوں کو اس سلسلے میں مایوسی اور بد دلی ہو تو کوئی تعجب نہیں۔ ابتدائی تعلیم اُردو میں دینے کے لئے مطالبات کی رفتار بھی اسی وجہ سے کم ہو جاتی ہے۔ اس طرح اُردو والوں کا جمہوریت میں عقیدہ مجروح ہوتا ہے، اس طرح اُن کو یہ احساس ہوتا ہے کہ کہنے کی بات اور کرنے کی بات میں فرق ہے۔ اور یہ قومی نقطۂ نظر سے مُضر ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انصاف کا اصول صرف یہ نہیں ہے کہ انصاف کیا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ انصاف معلوم ہو۔ چنانچہ اقلیتوں کے معاملے میں حکومت کی بڑی سے بڑی یاد دہانی کافی نہیں، اقلیتوں کا اطمینان ضروری ہے۔ اقلیتوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اچھے بھی اور بُرے بھی، سب سر پھرے نہیں ہوتے۔ سب اکثریت کی ہر بات سے بلا وجہ بدگمان نہیں ہوتے۔ مگر جب زبان کے معاملے میں یا کسی اور معاملے میں اقلیت کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا تو اقلیت کے اسی گروہ کو تقویت ہوتی ہے جو علیحدگی پسند ہے، جو اکثریت کے نقطۂ نظر کو سمجھنا نہیں چاہتا، جو جھگڑا بڑھانے میں اپنی کامیابی سمجھتا ہے۔ اس لئے نہ صرف حکومت کے ارکان بلکہ اکثریت کے معقول لوگوں کا بھی یہ فرض ہے کہ اقلیت کے معقول عناصر کی مدد کریں اور قوم کے اصولوں پر ایمان قائم رکھنے اور صحت مند میلانات کو ترقی دینے کے لئے

اقلیت کے جائز مطالبات کو قومی فریضہ سمجھ کر منوائیں اور ان پر قرار واقعی عمل کرائیں۔ ہر کوتاہی چاہے کسی چھوٹے افسر سے ہو یا بڑے افسر سے، جمہوریت کی ترقی میں رکاوٹ بنتی ہے، اردو میں ابتدائی تعلیم دینا حکومت کا فرض ہے، یہ فرض اسے ہر حال میں بجالانا چاہیئے اور قومی رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ سب سے اس فرض کی پابندی کرائیں اور ہر کوتاہی پر باز پرس کریں اور مناسب سزا دیں۔

انجمن ترقی اردو ساگر

انجمن ترقی اردو ساگر (مدھیہ پردیش) کے زیر اہتمام قومی دفاعی فنڈ کے سلسلے میں ایک مشاعرہ زیر صدارت شری جگ موہن داس وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ ۲۳ر دسمبر کو منعقد ہوا۔ مولانا وجدی الحسینی صدر انجمن ترقی اردو شاخ ساگر اور جناب ایم عرفان جنرل سکریٹری ریاستی انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش نے، جنگ آزادی میں اردو اور اردو شاعری نے جو خدمات انجام دی ہیں ان پر روشنی ڈالی۔ شری جگ موہن داس جی نے بھی قوم اور ملک کے حوصلے بڑھانے میں شعراء اور کویوں کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے جذبۂ وطن پرستی کو سراہا۔ مشاعرے میں چینی جارحیت پر نظمیں پڑھی گئیں جو بے حد پسند کی گئیں۔

انجمن ترقی اردو ساگر کی طرف سے قومی دفاعی فنڈ میں ۵۰۱ روپے کی تھیلی پیش کی گئی اور ہار قینچی اور کشتی جو رسم افتتاح میں پیش کئے گئے تھے ان کا نیلام کیا گیا۔ ہار کی آخری بولی محمد حسین خاں صاحب مہر سکریٹری انجمن ترقی اردو ساگر کی اور دیپہ تھی جس پر بولی ختم ہوئی۔ اسی طرح تقریباً ۹۲۴ روپے کی مزید رقم شری جگ موہن داس جی کی خدمت میں برائے قومی دفاعی فنڈ پیش کی گئی۔

انجمن ترقی اردو ساگر کی جانب سے ۴۰۰ دعوت نامے معزز اور ممتاز شہریوں کے نام جاری کئے گئے۔ قابل ذکر اصحاب جنھوں نے مشاعرے میں شرکت فرمائی، سرکاری اعلیٰ افسران کے علاوہ شریمتی سہودرا بائی ممبر پارلیمنٹ، مسٹر بھٹ وائس چانسلر ساگر یونی ورسٹی، جوالا پرشاد ممبر پارلیمنٹ، سیٹھ منی بھا ایم۔ ایل۔ اے، ڈاکٹر بی۔ پی رائے ایم۔ ایل۔ اے، حاجی محمد شفیع ایم۔ ایل۔ اے ہیں۔

(محمد حسین خاں سکریٹری)

انجمن ترقی اردو شاخ کلول

گزشتہ ہفتے میں انجمن ترقی اردو کلول گجرات کا ایک خصوصی جلسہ زیر صدارت شری مان بابو بھائی نائک ہیڈ ماسٹر صاحب بھارت ہائی اسکول کلول منعقد ہوا۔ شاخ کے آنریری سکریٹری جناب معزالدین عاقل نظامی صاحب نے انجمن کی کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے انجمن کے کام کو آگے بڑھانے اور جدید ممبر سازی وسیع پیمانے پر شروع کرنے کی تجویز پیش کی جو متفقہ طور پر منظور کی گئی۔ جناب ملک رسول بھائی کامل نظامی نائب صدر انجمن نے اردو کے مسئلے پر ایک بصیرت افروز تقریر کی۔ جناب شاغل صاحب صدر انجمن ترقی اردو کلول نے اردو کے متعلق اپنی ایک نظم پیش کی جو پسند کی گئی۔ جناب حافظ احسان احمد صاحب و مشکور احمد صاحب شائق ایڈیٹر ماہنامہ جرأت پالن پور نے بھی اپنا کلام سنایا۔ صدر جلسہ نے جامعہ کے سینٹر کو تقویت دینے کے لئے طلبہ کی تعداد بڑھانے کی پرزور حمایت کی۔

(معزالدین نظامی سکریٹری)

وطن کی حفاظت میں اردو شعرا کی ممتاز خدمات

ریڈیائی مشاعرہ میں شام ناتھ کی تقریر

نئی دہلی، یکم جنوری۔ چین کے حملے سے پیدا ہونے والے حالات میں اردو شاعروں نے اپنی قوتوں کو وطن عزیز کی حفاظت کے لئے وقف کر دیا ہے انھوں نے جس جوش اور تیزی کے ساتھ نظمیں لکھیں اس سے ان کی حب الوطنی کے گہرے جذبے پر روشنی پڑتی ہے۔

اس خیال کا اظہار یہاں آل انڈیا ریڈیو کی بزم مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے نائب وزیر اطلاعات و نشریات شری شام ناتھ نے کیا۔

شری شام ناتھ نے کہا یہ مشاعرہ اور ایسے بہت سے مشاعرے تاریخ کے خاص موڑ پر ہو رہے ہیں۔ یہ وہ موڑ ہے جس سے قوموں اور ملکوں کی ایک نئی زندگی شروع ہوا کرتی۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب نئے سماج کی تربیت ہنگامی حالات خود کرنے لگتے ہیں اور زندگی کی تمام قدریں خود بخود اپنا چولا بدلنے لگتی ہیں۔ چین کے حملے نے زندگی کے ہر پہلو پر اثر ڈالا ہے۔ یہ اثر سماج میں رفتہ رفتہ اپنی مستقل جگہ بنا رہا ہے۔ اردو شاعری نے بھی شدت کے ساتھ ہنگامی حالات سے اثر لیا ہے۔ اردو شاعری جنگ اور امن، خدا رسیدگی اور معرفت، حب الوطنی اور آزادی کا اعلیٰ مظہر اور نمونہ ہے۔ اردو شاعری نے تاریخ کے ہر مرحلے پر وقت کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔

تحریک آزادی میں جو قومی شاعری پیدا ہوئی اس نے عوام میں وہ کردار پیدا کیا جو ہماری آزادی کا ضامن بنا۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک اردو شاعری نے اپنے زمانے کے تقاضوں کو نہایت جرأت، فراخ دلی اور بھرپور جذبے کے ساتھ پورا کیا۔ آزادی کے بعد ملک کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں اردو شاعروں کے دلوں کی دھڑکنیں ہندستانی ادب کی تاریخ کا ایک یادگار اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ ابھی ہم آزادی کی دی ہوئی نعمتوں سے جی بھر کر لطف اندوز بھی نہ ہو سکے تھے، ابھی تعمیر و ترقی کے سارے خاکے نا تمام ہی تھے کہ وہ مرحلہ آ گیا جو آزاد قوموں کی زندگی میں اکثر رہتا ہے اس امتحان کے نازک موقع پر شاعروں نے پھر اپنے عزیز وطن کو اپنے خون جگر کی نذر دی۔ اور قوموں کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو شعرا اپنے پُرجوش نغموں سے قوم کے ولولے کو اور بھی ابھارتے رہیں گے۔

مسعود اختر جمال

جاگ اُٹھو

آج خطرے میں ہے ناموسِ وطن جاگ اُٹھو
شر بپا ہے سرِ گنگ و جمن جاگ اُٹھو
موج ہے برق صفت شعلہ فگن جاگ اُٹھو
پاسدارانِ روایاتِ کہن جاگ اُٹھو
دستِ قدرت میں ہے فرمانِ بزن جاگ اُٹھو
آج خطرے میں ہے ناموسِ وطن جاگ اُٹھو

پھر اُٹھا غلغلۂ دار و رسن جاگ اُٹھو
سوگ میں ڈوب گئے دشت و دمن جاگ اُٹھو
سرنگوں ہو نہ کہیں عظمتِ فن جاگ اُٹھو
تیرہ و تار ہے اقلیمِ سخن جاگ اُٹھو
آج خطرے میں ہے ناموسِ وطن جاگ اُٹھو

محفلِ ہند میں اغیار نہ آنے پائیں
اپنی جنت میں ستمگار نہ آنے پائیں
چین کے وحشی و خونخوار نہ آنے پائیں
جاں نثارانِ تب و تابِ چمن جاگ اُٹھو
آج خطرے میں ہے ناموسِ وطن جاگ اُٹھو

نذرِ گرگشتۂ صد نالہ و شیون نکلے
راہبر بن کے جو آئے تھے وہ رہزن نکلے
دوست ہم جن کو سمجھتے تھے وہ دشمن نکلے
تیغ کا مان ہے تو بت شکن جاگ اُٹھو
آج خطرے میں ہے ناموسِ وطن جاگ اُٹھو

رازِ توحید تمہیں پردۂ اصنام تمہیں
امن و انصاف کا آغازِ خوش انجام تمہیں
جنگ بازوں کے لئے موت کا پیغام تمہیں
تم کہ ہو نازِ جہاں فخرِ زمن جاگ اُٹھو
آج خطرے میں ہے ناموسِ وطن جاگ اُٹھو

دولتِ عشق کا عرفان نچھاور کر دو
سیم و زر کے سر و سامان نچھاور کر دو
اپنی سرحد کے لئے جان نچھاور کر دو
مطلعِ وقت سے پھوٹی ہے کرن جاگ اُٹھو
آج خطرے میں ہے ناموسِ وطن جاگ اُٹھو

نفع و نقصان سے اب گرمیِ بازار نہیں
جذبِ دل کیا ہے اگر جذبۂ ایثار نہیں
ہے وہ غدار، وطن سے جو وفادار نہیں
عشرتِ خواب سے اربابِ چمن جاگ اُٹھو
آج خطرے میں ہے ناموسِ وطن جاگ اُٹھو

برقِ رفتار ہو، سینہ سپر ہو کے بڑھو
متحد ہو کے اُٹھو، شیر و شکر ہو کے بڑھو
منزلیں چوم لیں قدموں کو جدھر ہو کے بڑھو
عصرِ حاضر ہے طلسمات شکن جاگ اُٹھو
آج خطرے میں ہے ناموسِ وطن جاگ اُٹھو

رحیم علی الہاشمی

قبلا خاں

(کولیرج کی مشہور نظم کا ترجمہ)

پُر فضا اک قصرِ عالی شان کی تعمیر کا
صاحبِ ذی جاہ قبلا خاں نے جب فرمان دیا
جس جگہ تھا الپھ کا دریائے باعظمت رواں
ایسے غاروں سے گزرتا جن کی نہ تھی پیمانشاں
ایک بحرِ بیکراں سے جا کے مل جاتا تھا وہ
بحر کی تاریکیوں سے جا کے ٹکراتا تھا وہ
دس کو میل کا شاداب رقبہ گھیر کر
چار دیواری اُٹھائی اور بنائے خوش نظر
لہلہاتا تھا باغ میں پانی کے چشمے تھے رواں
وہ مہکتے پھول شاخ و برگ جن کے بے خزاں
جھاڑیاں سرسبز جیسے ہو پہاڑی سبزہ زار
تھا کہیں سبزہ کہیں پر روش زمیں تھی خوشگوار
غار بھی اُس سمت تھا اک شرح خوف سا اور مہیب
ان سطر جھاڑیوں ہرائی کا منظر تھا عجیب
تھی جگہ سنسان جیسے کوئی رہنا بھوت کا
جیسے عورت دیو عاشق کے لئے محوِ بکا
ایک ہیبت ناک دھارا موجزن تھا برملا
سینۂ ہستی پہ جیسے سانس کا دورہ پڑا
اُٹھ رہا تھا ایک چشمہ با ہزاراں شور و شر
جس کے دھارے پر چٹانیں ناچتی تھیں بے خطر
پے بہ پے سلسل آسماں سے ژالہ باری جس طرح
یا کہ پھٹکنے سے جہاں گرتا ہو غلہ اس طرح
ان چٹانوں سے ہوا تھا پاک دریا اک رواں
جس کا پانی پانچ میلوں تک چلا جاتا دواں
جنگلوں اور وادیوں کی راہ سے ہوتا ہوا
بے نہایت غار جو تھے ان کے اندر ڈوبتا
اُٹھ کے پھر طوفان کی مانند جاتا بحر میں
خامشی سے ڈوب جاتا سرسراتا بحر میں
پھر اسی طوفانِ آب و باد میں آواز سی
دور سے آتی ہوئی قبلا نے کانوں سے سُنی
بس کہ تھی آواز یہ گزرے ہوئے اجداد کی
جنگِ خوں آشام کی دی پیشتر سے آگہی
قصرِ عالی شان کا سایہ تھا رقصاں لہر پر
جیسے اک رومان کا سایہ تھا رقصاں لہر پر
وادی و کہسار سے آواز آتی تھی دبی
بحر کی رفتار سے آواز آتی تھی دبی

معجزہ تھا یا کہ کیا تھا قصر کی تعمیر میں
قصر میں تھی برف اور وہ قصر تھا تنویر میں

ایک دن دیکھا تھا میں نے ایک منظر شبِ خواب
تھی دوشیزہ ایک جس کے ہاتھ میں تھی اک رباب
حبش کی تھی وہ دوشیزہ مستی میں تھی
اور رباب اپنی بجاتی تھی بصد فرزانگی
گا رہی تھی وہ ابورا کی پہاڑی کی غزل
کاش پھر سے جی کا بھی ارمان کچھ جاتا نکل
دل میں اپنے گر جگا لیتا میں اس کے راگ کو
مجھ میں بھر جاتی مسرت کی تمامی رنگ و بو
اک بلند آہنگ موسیقی سے جو ہو دیرپا
اک محل تعمیر کر لیتا میں بالائے فضا
قصرِ روشن بھی وہی اور غار برفانی وہی
جس نے کانوں سے سنا ہو آنکھ سے دیکھے وہی
سب پکار اٹھیں کہ ان سے خوب رہنا ہوشیار
وہ نگاہیں شعلہ افگن اور گیسو آبدار
گھیر لیں گے ہر طرف سے کھینچ کر تم حصار
بند ہو جائیں گی آنکھیں جو کہ ہیبت سے دوچار

کیونکہ اس کا خون تو ہے شہد شبنم سے بنا
اور جنت سے ہے اس نے دودھ کا پیالہ پیا!

نوری منضی

تین شعر

آپ مفہومِ محبت نہیں سمجھے اب تک
میرے جذبات کی قیمت نہیں سمجھے اب تک
اُن سے امیدِ تلافیِ غمِ دل ہے عبث
جو غمِ دل کی حقیقت نہیں سمجھے اب تک
آپ کا شکوہ بجا میری شکایت ہے مگر
آپ اندازِ شکایت نہیں سمجھے اب تک

مختار ٹونکی

سرمور گزٹ

ایک اخبار کا نام ہے جو "ناہن" سے شائع ہوتا تھا۔ میرے پاس اس کا صرف ایک شمارہ محفوظ ہے جو ۲۰ × ۳۰ سائز کے روپ میں ۱۲ سطر دو کالمی ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایڈیٹر یا مرتب کا نام بائنے بسم اللہ سنت نائے تمت تک معلوم نہیں ہوتا لیکن آخر میں اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اسٹیٹ پریس ناہن میں منشی سراج الدین پرو پرائٹر کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اول پیج کے نصف صفحے پر جلی حروف میں اخبار کا نام انگریزی اور اردو میں لکھا ہوا ہے اور مقام اشاعت تاریخ اشاعت جلد اور نمبر کی تفصیل درج ہے۔ میرے پاس دوسری جلد کے اکتیسویں نمبر کا پرچہ ہے جس کی مطبوعہ تاریخ ۷ر اگست ۱۸۸۹ء ہے۔ اسی صفحے کے آخری نصف حصے پر ایڈیٹر کی جانب سے بطور اداریہ یہ نوٹ تحریر ہے :۔

"مسودہ قانون ٹرسٹیان پر ہم آج کے اخبار میں عالی جناب مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی (سلمہ اللہ تعالیٰ) کا مضمون چھاپتے ہیں۔ ایک مضمون کے ساتھ خواجہ صاحب کا نام بیان کر دینا اس غرض کے لیے کافی ہے کہ اس کی بے شمار خوبیاں لوگوں پر ظاہر ہو جائیں۔ مضمون نہ تعریف کا محتاج ہے اور نہ اس قلم میں یہ قابلیت ہے کہ اس کی تعریف کر سکے وہ تو مثل آفتاب کے ہے جس کی عالم گیر اور سب پر یکساں احسان کرنے والی روشنی کسی نشان ہی کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ کہنا بھی مضمون کی قدر و منزلت کو صدمہ پہنچانا ہوگا کہ اس کا متین اور شریف طرز بیان جس قدر دل پر اثر کرنے والا ہے اسی قدر وہ مضمون نگاروں کو عمدہ مضمون نگاری کا سبق دینے والا ہے۔ طریق استدلال اور واقعات کا بیان گو سیدھا سادہ اور بے جا جانب داری اور تصنع سے بالکل خالی ہے مگر عالمانہ کمالیت سے خالی نہیں ہے۔ خواجہ صاحب نے ہمارے ملک کے نوجوان قلموں پر ایک بہت بڑا احسان یہ کیا ہے کہ مشن کالج کے متعلق بہت سے ابتدائی اور دیرینہ واقعات جو صرف پرانے دلوں کا ذخیرہ تھے اس مضمون میں حسب ضرورت بیان فرمائے ہیں اور اس طریق سے وہ ہمیشہ کے لئے ایک وجود پکڑ گئے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اپنے دوستوں سے مضمون کے لئے کسی قسم کی سفارش کریں مگر اپنے اخبار نویس بھائیوں سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی صاحب اس مضمون کو اپنے اخبار میں نقل کرنا چاہیں تو تمام مضمون کو بالاستیعاب ایک ہی بار چھاپیں تاکہ مضمون کا لطف اور مطلب فوت نہ ہونے پائے۔"

دوسرے صفحے پر بھی خود ایڈیٹر نے مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر کے اُس پمفلٹ پر تبصرہ کیا ہے جس میں انہوں نے مسودہ قانون ٹرسٹیان پر اعتراضات اٹھائے تھے اور بے حد نکتہ چینی کی تھی۔ صاحب اخبار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سمیع اللہ خاں نے محض اپنی خود غرضی، سرسید سے مخالفت، سید محمود سے رنجش اور علی گڑھ کالج کے لئے اپنی سکریٹری شپ کا راستہ ہموار بنانے کی وجہ سے پمفلٹ شائع کیا ہے۔ سمیع اللہ خاں کی مذمت کے ساتھ مسٹر بیک کی توصیف کی گئی ہے اور ان کو سرسید احمد خاں کا دایاں بازو ہی نہیں بلکہ دوسرا سرسید احمد خاں کہا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں سرسید احمد خاں کا ایک تاریخی خط بھی نقل کیا ہے جس کا مضمون یہ ہے :۔

"مخدومی ایڈیٹر سرمور گزٹ۔ آپ کے اخبار مطبوعہ ۲۰ جولائی میں جو کچھ نسبت مسودۂ قانون ٹرسٹیان لکھا ہے اس کا شکر ادا کرتا ہوں اور جناب کے دوست دانش مند صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ تین برس تک میرے خط کو محفوظ رکھ کر چھپوا دیا۔ مسودۂ قانون ٹرسٹیان میں سید محمود کو جوائنٹ سکریٹری اور بعدش سکریٹری تجویز کرنے کی ضرورت اور بورڈنگ ہاؤس اسٹاف کی موجودہ حالت کے قائم اور درست رکھنے کے لئے بہ نسبت آئندہ کی ضرورت کے بہت زیادہ ہے اور اسی موجودہ ضرورت کے خیال سے وہ دفعات بنائی گئی ہیں۔ اگر اس ضرورت کی بنا صرف اسی قدر ہوتی کہ مجھ کو دوسروں کی نسبت کچھ کہنا پڑتا تو میں ضرور اس کو چھاپ دیتا مگر میرا طریقہ بُرا سُننے کا ہے بُرا کہنے کا نہیں۔ اب ہر شخص کو اختیار ہے کہ اس کو جس امر پر چاہے محمول کرے۔ مگر آپ یقین کیجئے کہ موجودہ حالت میں کالج کی بہتری کے لئے وہ تجویز لازمی اور ضروری تھی۔ فقط والسلام

خاکسار سید احمد

علی گڑھ ۳ر اگست ۱۸۸۹ء"

تیسرے صفحے سے تیرہویں صفحے تک مولانا حالیؔ کا طویل مضمون اس طویل سرخی کے ساتھ درج ہے۔

"مسودہ قوانین و قواعد تقرر و طریقہ کارروائی ٹرسٹیان محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ پر اور ان اعتراضات و شبہات پر جو مسودہ مذکور کی اکثر دفعات پر وارد کئے گئے ہیں، ریمارک"

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے مضمون اپنی جگہ بہت اہم ہے مولانا حالیؔ نے صورت حال کی جزئیات اور تمام واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے بڑی وضاحت سے سمیع اللہ خاں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے اور سرسید احمد خاں کے اقدام کو مستحسن اور کالج کی بقاء و بہتری کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ مضمون کے شروع میں اس پر بحث کی ہے کہ مدرسۃ العلوم کا قیام جمہوری تھا یا شخصی، اور سمیع اللہ خاں کے اس دعوے پر کہ مدرسہ کی بنیاد کی خیالی تصویر کو عملی جامہ انہوں نے ہی پہنایا، ایک جامع تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے اس بات کے ماننے میں بھی مولانا تامل کرتے ہیں کہ کالج کا انتظام اور حفاظت صرف کمیٹیوں کے مشورے سے ہی انجام پاتی رہی بلکہ یہ سب کچھ سکریٹری کی ذات پر ہی موقوف تھا۔ اس کے بعد سمیع اللہ خاں کے مندرجہ ذیل اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے :۔

(۱) "بطور ایک قاعدے کے آنریبل جسٹس محمود کو جو آنریری جائنٹ سکریٹری مادام الحیات اور بعد خالی ہونے عہدہ آنریری سکریٹری (سر سید احمد خاں) کے ان کو لائف آنریری سکریٹری قرار دیا گیا ہے" کیوں؟ جب کہ "سید محمود کی لیاقت ایک عہدہ جسٹس کے لئے کیسی ہی عمدہ اور موزوں ہو لیکن وہ جائنٹ سکریٹری یا مادام الحیات عہدۂ سکریٹری مدرسۃ العلوم کے لئے ناموزوں ہیں" اور "مدرسۃ العلوم حکومت شخصیہ نہیں ہے کہ باپ کے بعد بیٹا بطور ولی عہد کے تسلیم ہو۔"

(۲) مسودہ قانون مذکور تیار کرانے میں "مسٹر اسٹریچی بیرسٹر ایٹ لا سے قانون بنوانے کی اور ان کو معاوضہ دینے کی کیا ضرورت تھی جبکہ مسٹر محمد رفیق اور مسٹر حمید اللہ وغیرہ وغیرہ بیرسٹر جو ہمارے ہی کالج کے طالب علم ہیں اور مسٹر اسٹریچی کی لیاقت سے کم لیاقت نہیں رکھتے موجود تھے۔"

(۳) بورڈنگ ہاؤس میں کسی یوروپین پرنسپل کی نگرانی اور مداخلت غیر ضروری ہے۔ "اسی ملک کا ایک تجربہ کار مستقل مزاج مسلمان جو بورڈروں کے اخلاق درست کرے بورڈنگ کا منتظم ہونا چاہئے تھا۔"

(۴) "جو لوگ قوم کے لیڈر (مراد سر سید احمد خاں) ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بھی خانگی معاملات اور ذاتی غصہ کو قومی رفاہ کے کاموں میں موثر قرار دیتے ہیں۔"

مولانا حالی کا یہ مضمون اگرچہ خشک موضوع پر مبنی ہے مگر ان کے زور استدلال اور منطق و تجزیہ کی وجہ سے بہت دلچسپ ہو گیا ہے[1]

چودھویں اور آخری صفحے پر نجم الہند سردار محمد حیات خاں کی صحت یابی اور خان بہادر صاحبزادہ جہاں داد خاں بہادر چیف آف گکھڑ کی شاہ پور تبدیلی کی اطلاع دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ایک دو دو سطروں میں مختلف خبریں درج ہیں۔

[1] قاسم علی سجن لال نے خدائے ادب بمبئی میں مولانا حالی کا پورا خط شائع کر دیا ہے۔

یکم جنوری ۱۸۸۸ء کو سرحد گزٹ کا اجرا ہوا تھا۔ اس کے مالک و ایڈیٹر منشی سراج الدین احمد کئی کتابوں کے مولف بھی تھے۔ ان کی چند تالیفات کے نام یہ ہیں:

مجموعہ لکچرز (سر سید احمد خاں) — ۱۸۹۲ء
سیرۃ الفاروق — ۱۸۹۲ء
تہذیب (علم الاخلاق) — ۱۸۹۳ء
حیات صلاح الدین — ۱۸۹۹ء

(باقی آئندہ)

آزاد میموریل لائبریری (حیدرآباد) میں یوم ظفر

آزاد میموریل لائبریری اینڈ ریڈنگ روم پرانی حویلی (حیدرآباد) کی جانب سے بہادر شاہ ظفر کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ آندھرا پردیش کے وزیر اطلاعات شری بی۔ وی۔ نرسمہا نے جلسے کی صدارت کی اور مغلیہ سلطنت کے چشم و چراغ پروفیسر آغا حیدر حسن نے جلسے کا افتتاح کیا۔ وزیر اطلاعات نے کہا کہ چین کے جارحانہ حملے کی وجہ سے ظفر اور ایسی ہی دوسری ہستیوں کی یاد منانا دوہری اہمیت رکھتا ہے۔ آج ہمارے ملک میں آزادی کے تحفظ کے لئے ۱۸۵۷ء کا سا جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے اگر ہم بہادر شاہ ظفر کے حوصلے، عزم اور جذبے کے ساتھ کام کریں تو چینی حملہ آوروں کو اپنے ملک سے باہر نکال سکتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ ظفر نے وطن کی خاطر سب کچھ قربان کر ڈالا، وہ آخری تاجدار ہی نہیں بلکہ پہلے محب وطن بھی تھے۔ شری ایم۔ باگا ریڈی ایم۔ ایل۔ اے صدر لائبریری نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ ظفر کے دور میں ہی اردو نے زبردست ترقی کی اور عظیم اور ممتاز ادبی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ وطن کی حفاظت کے لئے بہادر شاہ ظفر کا جذبہ ہمیں سیکھنا چاہئے۔ پروفیسر آغا حیدر حسن نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ ۱۹۴۷ء تک ظفر کا نام لینا ہمارے ملک میں جرم سمجھا جاتا تھا لیکن آزادی کے بعد ان کا نام ہر ایک کی زبان پر ہے، آپ نے ظفر کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ مسٹر میر کمال الدین علی خاں سکریٹری ادارہ نے ظفر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ جس آزادی کے پودے کو ظفر نے لگایا اور جس کی آبیاری میں گاندھی جی، ابو الکلام آزاد، سردار پٹیل، راجندر بابو اور رادھا کرشنن جیسے سورماؤں نے حصہ لیا اور جو محبوب وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی مساعی جمیلہ سے تناور درخت بن چکا ہے اس کی حفاظت میں ہندوستانی عوام کو تن، من، دھن کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ سعادت نظیر لکچرار نے اپنے مقالے میں ظفر کی شاعری پر تبصرہ کیا اور انھیں ایک زبردست شاعر، مفکر اور محسن اخلاق قرار دیا۔ مشاعرے میں حیدرآباد کے مشہور شعراء نے حصہ لیا۔

(میر جمال الدین علی سلطان نائب صدر)

بقیہ: موجودہ حالات اور ادیب

آخر میں ایک بات اور عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ بظاہر موجودہ حالات کے فوری طور پر رونما ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ ہمارے ادیبوں میں وطن دوستی کے جذبات ایک بار پھر شدت سے سامنے آئیں گے لیکن اگر ان کی بنیاد گہرے قومی اور تہذیبی شعور پر نہ ہوئی تو یہ محض وقتی ہیجان کی صورت اختیار کرکے رہ جائیں گے اور سوائے ہنگامی قسم کی ہو حق کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وطنیت کے جوش کا ایک سیلاب پندرہ بیس برس پہلے ہماری نگاہوں کے سامنے گزر چکا ہے وہ ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ تھا! دھواں دھار نظموں، پرجوش تحریروں اور شعلہ بار لفظوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ ہر دل وطن کے درد محبت اور آزادی کی لگن سے چور تھا۔ سامراج دشمن خیالات اور وطن کے ذرہ ذرہ سے محبت کے جذبات نے زندگی میں قوت و توانائی کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی اور فلک شگاف نعروں، دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کے انباروں نے شعر و ادب کے قلب و نظر کو گرما کے رکھ دیا تھا لیکن آزادی ملنے کے بعد وطنیت کی یہ چڑھی ہوئی کمان اتنی جلدی اُتر گئی کہ خود ناقدین انداز حیران رہ گئے۔ پچھلے پندرہ برس کے ادب پر نظر ڈالئے تو مجموعی طور پر ایک ایسے دریا کا نقشہ سامنے آتا ہے جس کا پاٹ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے جس میں ملک کے شاندار ماضی اور اس کی تہذیبی اور قومی روایتوں کی وہ لہریں نہیں ملتیں جن کی آزادی کے بعد توقع تھی۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس کی ایک وجہ تو اردو کے حقوق کی پامالی ہے لیکن دوسری اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اگر وطنیت کی بنیادیں مضبوط ہوتیں یا ان جذبات کی جڑیں ادیبوں کے ذہن و شعور میں گہرے طور پر پیوست ہوتیں تو آج ہم اس المیے سے دوچار نہ ہوتے۔ آزادی سے پہلے کی ڈیڑھ دہائی میں ہمارے وطنی جذبات کی نوعیت تمام تر احتجاجی تھی اور اُن کی بنیاد غور و فکر پر نہیں بلکہ بعض سیاسی پارٹیوں کے اصول و عقائد پر رکھی گئی تھی۔ آزادی ملتے ہی ان سیاسی اصولوں کی ہنڈیا چوراہے پر پھوٹ گئی اور ہمارے شاعر و ادیب یوسف بے کارواں کی طرح مدتوں کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر بھٹکتے پھرے۔ بالآخر اکثر نے داخلیت کے مرمریں گنبد کا رُخ کیا اور من کی موج میں ڈوب گئے یا غم ذات کے دھندلکوں میں کھو گئے۔

تاہم پچھلے پندرہ برس کا سخت سے سخت نقاد بھی اس بات کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس دور میں ادب کے صحت مند امکانات کے لئے امید کی ایک کرن پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ادب نے اس دوران میں اپنے پچھلے تلخ تجربات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کم از کم سیاست کے چنگل سے رہائی حاصل کر لی ہے۔ اب کسی بھی سیاسی پارٹی کی طرف سے مداخلت کا خواہ وہ کیسے ہی حسین بہانوں کی آڑ میں کی جائے روادار نہیں ہو سکتا۔ فرد کی آزادی کو ادبی اقدار کی سب سے بڑی ضمانت تسلیم کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ ان حالات میں امید بندھتی ہے کہ اب کی بار وطنیت کے جو جذبات پیدا ہوں گے وہ سیاسی طوفان و تھپیڑے سے زیادہ دیرپا، توانا، ہمہ گیر اور جاندار ہوں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی قدیم روایتوں، ماضی کے سرمائے اور اپنی مشترکہ میراث کا واضح احساس رکھتے ہوں اور اپنے قومی مزاج کی ان بنیادی اقدار سے واقف ہوں جن سے ہماری زندگی کی شیرازہ بندی میں مدد ملتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں یہاں صرف دو خصائص کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے: ایک یہ کہ ہمارے قومی مزاج کی بنیاد کشمکش پر نہیں بلکہ ہم آہنگی پر ہے جسے یوں پہلے فطرت کے فیاض اور بھرپور عمل کے اثر سے ہندستانی ذہن میں تسخیر فطرت کی عملی خواہش بڑی حد تک معطل رہی اور نظام کائنات سے ہم آہنگی کا جذبہ راسخ ہو گیا۔ صلح جوئی اور امن پسندی ہماری فطری خصوصیات ہیں۔ ہندستانی ذہن کا شعور اخلاق یہ نہیں کہ دنیا بدی کی قوتوں سے معمور ہے بلکہ یہ کہ کائنات میں نیکی اور عدل کے اصول کارفرما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستانی مزاج ہر منزل میں جنگ پر امن اور تخریب پر تعمیر کو ترجیح دیتا رہا ہے۔ ہماری عام ذہنیت تشدد اور مخاصمت نہیں بلکہ مصالحت، مفاہمت، رواداری اور محبت کی ہے۔ چنانچہ ہم چینیوں پر ان کی در پردہ فوجی تیاریوں کے باوجود برسوں تک بھروسہ کرتے رہے اور انھیں دوست سمجھتے رہے ہیں۔ ہماری ابتدائی پسپائی کو بھی اسی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ وہ بے توجہی کا نتیجہ ہو یا غفلت شعاری کا، لیکن اس کا تعلق ہمارے مزاج کی اسی خوبی یا خامی سے ہے کہ ہم شر میں نہیں، خیر میں یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم جنگ کے لئے کمربستہ بھی ہوئے ہیں تو جب ہتھیار اُٹھانے پر ہمیں مجبور کر دیا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ بعض جغرافیائی اثرات کی بدولت ہندستانی ذہن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ نہیں توڑتا۔ ہماری عام ذہنی کیفیت جوش و خروش نہیں بلکہ صبر و تحمل ہے۔ ہمارے طرز عمل میں تبدیلیاں شدید جھٹکے کے ساتھ نہیں بلکہ دھیرے دھیرے رونما ہوتی ہیں یعنی ہندستانی ذہن انقلاب پسند نہیں بلکہ ارتقا کا قائل ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہی نہیں ہوئیں بلکہ یہ کہ تغیر کا عمل بتدریج واقع ہوا ہے اور وحشی کی ایک جست کی طرح بیچ کی کڑیاں غائب نہیں ہوتیں۔ ہم نئے نظریات قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں لیکن ہماری جڑیں قدیم روایات میں پیوست ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اسی بات کو یوں کہا تھا کہ میں تازہ ہوا کے لئے ذہن کے دریچوں کو کھولے رکھنا چاہتا ہوں لیکن میرے قدم اپنی ہی سرزمین پر مضبوطی سے جمے ہیں۔ ہندستانی ذہن کی اس خصوصیت کا اظہار آزادی کے بعد ان پندرہ برسوں میں قدم قدم پر ہوتا رہا ہے۔ ہم نے فلاحی ریاست کا ڈول ڈالا ہے اور سوشلسٹ نظام کی بعض خوبیوں کو اپنے آئین کا سنگ بنیاد بنایا ہے۔ زمینداری کو ختم کیا ہے۔ انشورنس کو قومیایا ہے۔ بجلی اور فولاد کے بڑے بڑے سرکاری کارخانے قائم کئے ہیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں مرکز کے رول کو تسلیم کیا ہے اور نجی حلقے کے ساتھ ساتھ سرکاری حلقے کو بھی توسیع دی ہے لیکن جبر و تشدد یا آمریت کے ذریعہ نہیں، عوام کی روح کچل کے نہیں بلکہ عوام کو بتدریج بیدار کرکے۔ بلا شبہ جمہوری اور آئینی طریقہ سست رفتار ہوا کرتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہمارا مزاج اسی کی اجازت دیتا ہے یعنی ہندستان کی جمہوری روح کا تقاضا یہی ہے کہ فرد کی عظمت کو سب سے مقدم سمجھا جائے اور غور و فکر اور اظہار رائے کی پوری پوری آزادی دی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی ہمارے خوابوں کی تکمیل نہیں ہوئی۔ ابھی ہم چھوٹی وفاداریوں اور سول خود غرضیوں سے بلند نہیں ہوئے۔ ابھی ہم میں سیکولرزم کی صحیح روح پیدا نہیں ہوئی لیکن اسی لئے ہمیں احساس ہے کہ ہمارے آئین کی بنیاد جن صالح تصورات پر رکھی گئی ہیں اور ہم اپنی صدیوں کی کوتاہیوں کے باوجود اپنے تصور تک پہنچنے کی جستجو میں ہیں۔ جمہوری نظام ہم پر باہر سے لاد کر نہیں بلکہ ہمارا اپنا پسند کیا ہوا ہے۔ ہم میں سے بعض حضرات کو اس کا پورا احساس نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ آج ہندستان میں غیر مذہبی جمہوری ریاست کے سوشلسٹ ڈھانچے کو قائم کرنے کا جو تجربہ کیا جا رہا ہے وہ تاریخ کی نگاہوں میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ ضرورت اس بات کی نہیں کہ ہم حکومت کے ہر کام میں ہاں میں ہاں ملائیں بلکہ چاہئے کہ ہم نئے تجربے کی اہمیت کو واضح کریں، غور و فکر کی دعوت دیں اور جمہوریت کی روح سے محبت کو عام کریں، بے یقینی، تنگ نظری اور بدگمانی کی دھند کو دور کریں اور حق و حریت کی راہ پر چلتے ہوئے یقین اور اعتماد کی شمع کو فروزاں رکھیں۔

(ادبی مجلس نئی دہلی میں پڑھا گیا)

ماسٹر جگت سنگھ کا انتقال

یہ خبر افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ ۲۶ر دسمبر کو دہلی میں سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ آپ رہنمائے تعلیم کے ایڈیٹر تھے جو اردو کا قدیم رسالہ ہے۔

مولانا محمد علی مرحوم کے ایک مضمون کی اشاعت

مولانا محمد علی مرحوم ایڈیٹر 'کامریڈ' کے شہرۂ آفاق مضمون "The Choice of the Turks" جسے ہندستان کی برطانوی حکومت نے ۱۹۱۲ء کے اواخر میں ضبط کر لیا تھا، اب ایک دیباچہ کے ساتھ تعلیمی مرکز کراچی نے شائع کیا ہے۔ یہ مضمون ۵۰ سال کے بعد پہلی بار شائع ہوا ہے۔

بزم سخن موتی باغ (نئی دہلی)

"بزم سخن موتی باغ نئی دہلی کی نشست صابر ابوہری کی قیام گاہ پر زیر صدارت جناب جگن ناتھ آزاد منعقد ہوئی جس میں مندرجہ ذیل قرارداد باتفاق رائے پاس کی گئی۔

"بزم سخن موتی باغ کا یہ اجلاس ہندوستان پر چین کے جارحانہ حملے کی پُرزور مذمت کرتا ہے۔ اور ان شہیدان وطن کو شردھانجلی پیش کرتا ہے جنھوں نے مادر وطن کی آبرو اور آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں۔

مزید یہ اجلاس حکومت ہند کو یقین دلاتا ہے کہ اس بزم کا ہر ایک ممبر ہر ممکن طریقے سے گورنمنٹ کی امداد کرے گا اور ہر وہ قربانی کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے گا جو مادر وطن کی عزت اور حفاظت کے لئے ضروری ہو گی۔"

آخر میں صاحب صدر نے اپنی یوروپ کے حالیہ دورے کے دوران لکھی ہوئی نظمیں سنائیں جو بے حد پسند کی گئیں۔

مجلہ علوم اسلامیہ

مجلہ علوم اسلامیہ (ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ) کا نیا شمارہ شائع ہو گیا ہے جو حسب ذیل مقالات پر مشتمل ہے: ارسطو کے ایک قدیم ترجمے لغوی استفادے کی تدبیر (ڈاکٹر صبیح احمد کمالی)، چوتھی صدی ہجری میں عراق اور مغربی ایران کی سیاسی و معاشرتی حالت (ڈاکٹر محمد عبدالحق)، شیخ محمد عبدہٗ کی اصلاحی تحریک (محمود الحق)، کچھ محمود الاستاد ار کے متعلق (ڈاکٹر مختار الدین احمد)، دیوان قاسم غنیجہ (ڈاکٹر شمعون اسرائیلی)۔ قیمت پانچ روپے ہے۔

محور

محور (دہلی) اُردو کا نیا دو ماہی رسالہ ہے جو منور لکھنوی زبیر رضوی، اور نریندر لُتھرچل کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ جنوری ۱۹۶۳ء میں اس کا دوسرا شمارہ شائع ہوا ہے جو دو مضامین، پانچ نظموں، پانچ غزلوں اور ایک دوہے پر مشتمل ہے۔ سالانہ چندہ چھ روپے ہے اور $\frac{۶-۱۶}{۱۲}$ ویسٹرن ایکسٹینشن ایریا، نئی دہلی ۵ سے مل سکتا ہے۔

انسائکلوپیڈیا آف اسلام کا نیا اڈیشن

انگریزی کی مشہور و معروف کتاب "انسائکلوپیڈیا آف اسلام" کے جدید اڈیشن کے لئے جو ۱۹۵۴ء سے چھپنا شروع ہوا ہے، ایک ادارہ راکفیلر فاؤنڈیشن نے ۴۰ ہزار ڈالر کی اعانت منظور کی ہے۔ اس کے اصلی ناشر لیڈن (ہالینڈ) کی ای۔ جے۔ برل کمپنی ہے۔

اسٹوڈنٹس یونین (حیدرآباد)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے اسٹوڈنٹس یونین اُردو آرٹس کالج کا افتتاح کیا۔ یہ جلسہ اُردو ہال میں منعقد ہوا ڈاکٹر مسعود حسین نے کہا کہ اُردو آرٹس کالج نے وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ اُردو آرٹس کالج کی بقا اور ترقی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کی طرف بھی توجہ کی جائے۔ ایسی صورت میں نہ صرف اس کالج کو ترقی حاصل ہوگی بلکہ اُردو کی تعلیم بھی وسیع تر ہو جائے گی۔ آپ نے کہا کہ اُردو مدارس کے قیام اور ذریعۂ تعلیم کی ذمہ داری حکومت کو قبول کرنی چاہئے۔

(ارشاد علی خاں منتظم)

فضا پر فتح پانے کے ڈاک کے ٹکٹ

ماسکو۔ ۲۰ر نومبر، سوویٹ یونین نے کل ۳ انچ چوڑا اور ۶ انچ لمبا ڈاک کا ٹکٹ ان روسی ہوابازوں کی یاد میں جاری کیا ہے جنھوں نے فضا کو کھنگالا اور اس پر فتح پائی۔

سر چارلس ڈارون کا انتقال

برطانیہ کے ایٹمی بم کے تحقیقاتی کام کے خاص مہتمم سر چارلس ڈارون کا لندن میں ۲ر جنوری کو انتقال ہو گیا۔

سر چارلس جن کی عمر ۷۵ سال کی تھی، انیسویں صدی کے مشہور سائنس داں چارلس ڈارون کے پوتے تھے۔

[illegible]

مالک انجمن ترقی اُردو علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر نصیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر دفتر انجمن سے شائع کیا۔

مراسلات

فعلن، مفاعلن، فعلات، مفاعلن

ایک مقامی انجمن نے اپنے ماہانہ مشاعرے کے لئے مصرعِ طرح کی بجائے حسب ذیل ارکان دیئے ہیں۔

فعلن، مفاعلن، فعلات، مفاعلن

ایک دیرینہ خادم ادب کی حیثیت سے کچھ طلبہ نے مجوزہ ارکان کی نسبت مجھ سے تشفی چاہی، میرے لئے فرداً فرداً مطمئن کرنا مشکل ہے۔ میرے علم کی حد تک یہ ارکان کسی ایک بحر کے نہیں ہیں اور نہ بلحاظ ترتیب اس سے کوئی بحر پیدا ہوتی ہے، البتہ بحر مضارع (مثمن اخرب مکفوف محذوف) کا آہنگ پیدا ہوتا ہے جس کی اصلی تقطیع (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) ہے۔

اصلی اوزان رکھتے ہوئے، غیر متعلق فروع سے مزید ہم صوتی ارکان جو اسباب و اوتاد و فاصل کے اعتبار سے ارکان اصلی کے مطابق نہیں ہوتے، رائج کرنے کی کوشش کرنا، مبتدیوں کو گمراہ کرنے کے مترادف ہے۔ تعجب ہے کہ انجمن مذکور کے کرتا دھرتا اپنی اس کھلی لغزش کو تسلیم کر لینے کی بجائے، اپنے مجوزہ ارکان کی صحت ترتیب کے مدعی ہیں چنانچہ اس سلسلے میں مشاعرہ سے قبل کسی صاحب نے اوٹ پٹانگ ایک مضمون بھی پڑھ دیا جس میں زبردستی زحافات کی بحث ٹھونس کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف کے اصلی ارکان یہی ہیں جو ان کے دعوت نامے میں چھپے ہیں، ایک علمی مسئلے میں ضد اور ڈھٹائی ویسے بھی نادرست بات تھی مگر اس سے بہت سے مبتدی بھی گمراہ ہو رہے ہیں۔

بہر حال اگر یہ ناقابل اعتنا بات تحقیق کی کسی منزل میں موضوع بن سکتی ہے تو براہ کرم آپ اپنی رائے اور فیصلے سے بھی مطلع فرمائیے۔

(اوج یعقوبی)

(نوٹ) مراسلے میں دیئے ہوئے ارکان پر میں نے غور کیا جہاں تک مجھے علم ہے یہ ارکان (فعلن مفاعلن فعلات مفاعلن) کسی متعارف بحر سے متعلق نہیں۔ دیکھنے اور ذرا بھی واقف ہونے والے کو ان کی مثال کی کوئی مثال ملتی ہے۔ کسی بحر سے جزوی اشتراک یا مماثلت دوسری بات ہے۔ مگر یہ کافی نہیں۔

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف کے اصلی ارکان یہی ہیں۔ مذکورہ بحر کے ارکان تقطیعی طور پر مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن ہیں۔

اس کے علاوہ بحر مضارع مثمن سالم کے اصلی ارکان مفاعیلن فاع لاتن مفاعیلن فاع لاتن ہیں اور یہ بات قطعی ہے کہ ان ارکان کی مزاحف شکل فعلن مفاعلن فعلات مفاعلن جو زیر بحث ہے اہل عروض کے نزدیک مسلم نہیں۔

(مولوی) ضیاء احمد

تام نیکو رفتگاں

۶۲ گذر گیا، اب ہم ۶۳ میں قدم رکھ رہے ہیں نیا سال مبارک ہو۔ مگر پرانے سال کے زخم ابھی تازہ ہیں۔ ۶۲ نے ہم سے ہمارے بہت سے بزرگوں کو جدا کر دیا۔ ہماری آنکھیں ان کے لئے پُرنم ہیں، ہمارے سر عقیدت سے خم ہیں۔ سب سے پہلے حمید نظامی گئے، پھر وہ بی بی سی کا بولنے والا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ غیاث الدین قاضی کو قضا آئی، طرزی نے آنکھیں بند کر لیں۔ شارب جدا ہوا، اشرف جدا ہوا! شاہد صدیقی بھی چل بسا۔ اور جب حفظ الرحمن نے اردو کے لئے خون دینا چاہا تو فرشتۂ اجل نے اس کا مقدس خون چوس لیا، اور صرف اسی پر بس نہیں، اس نے اردو پر بھی زور آزمائی کی۔ نوح کی کشتی حیات بھی طوفانِ اجل کی زد میں آ گئی۔ شاعر اور خواجہ نے بھی رخت سفر باندھا۔

ہم نے شمشیر اٹھائی ہے صداقت کے لئے
امن و تہذیب شرافت کی حفاظت کے لئے
سر بکف آج ہیں ہم ہند کی عزت کے لئے

ان کے علاوہ ہماری آنکھیں ان کی یاد میں بھی اشک آلود ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی درجہ میں بھی اردو سے تھا۔ ہمارے کتنے ہاکر چل بسے کتنے ایجنٹ جاتے رہے۔ ہم اپنے کاتبوں کو بھی یاد کرتے ہیں اور کمپوزیٹروں کو بھی، ٹائپسٹوں کو بھی، نقل نویسوں کو بھی۔

اور ہماری آنکھیں نیاز فتحپوری کے لئے بھی اشک ریز ہیں ہاں، وہ ہم ہندوستانیوں کے لئے غیر ہو گئے۔ خدایا، اس طرح بھی لوگ رخصت ہوا کرتے ہیں؟

ان کی روحوں پر امن و شانتی کا سایہ تا ابد رہے!

(ماتم گسار: اقبال کرشن)

بڑھے چلو

روڑی مل کالج دہلی یونیورسٹی دہلی نے اردو کی ان نظموں کا انتخاب شائع کیا ہے جو ہندوستانی سرحدوں پر چینی حملے کے خلاف لکھی گئی ہیں۔ انتخاب کے نگراں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ اور مرتب خلیق انجم ہیں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ اور ملنے کا پتہ یہ ہے:

بزم ادب، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی دہلی

اُردو ٹائپ لُغت اور بین الاقوامی اعراب

جناب گیان چند کا مضمون "اُردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ" مطبوعہ "نوائے ادب" بمبئی (سہ ماہی، شمارہ اپریل ۱۹۶۲ء) نظر سے گزرا۔ اُس میں نوشتہ ہے:

"یکم فروری سنہ ۱۹۶۲ء کے ہماری زبان میں جناب احسن اللہ بی۔ اے کا مضمون شائع ہوا ... میں انھوں نے ... کو رومن حروف میں لیکن اُردو اعراب کے ساتھ لکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ جنوری سنہ ۱۹۶۲ء کے نوائے ادب میں جناب سید شہاب الدین دسنوی کا قابل قدر مضمون "اُردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ، ایک نئی تجویز" شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے لغات میں تلفظ کی وضاحت اور ٹائپ کی حد تک سفارش کی ہے کہ تمام حروف منقطع لکھے جائیں (جن میں مصمتے (حروف صحیح) اُردو کے، اور مصوتے (حروف علت) بین الاقوامی صوتیاتی انجمن (I.P.A) کے ہوں۔ موخر الذکر رسم الخط رومن رسم الخط پر ہی مبنی ہے میں دونوں تجاویز پر محو حیرت ہوں"[1]

میں اس باب میں اوّل الذکر مضمون (جس میں اُردو کو رومن میں لکھنے کی تجویز ہے اور اس میں اُردو اعراب لگانے کا مشورہ ہے) کے حق میں تو نہیں ہوں، لیکن موخر الذکر تجویز پر سنجیدگی سے سوچنے کی جرأت کرتا ہوں اور صوتیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی اس طرف توجہ دینے کی گزارش کروں گا!

گیان چند صاحب، سید شہاب الدین صاحب کے مضمون کے لئے فرماتے ہیں:

"موخر الذکر رسم الخط رومن رسم الخط ہی پر مبنی ہے" گیان چند صاحب نے بھی اس سے پہلے خود دسنوی صاحب کے مضمون کے لئے فرمایا ہے: "موصوف (سید شہاب الدین دسنوی) نے لغات میں تلفظ کی وضاحت اور ٹائپ کی حد تک سفارش کی ہے کہ تمام حروف منقطع لکھے جائیں جن میں مصمتے (حروف صحیح) اُردو کے اور مصوتے (حروف علت) بین الاقوامی صوتیاتی انجمن (I.P.A) کے ہوں"

ان دونوں باتوں میں ایک باریک تضاد ہے[2] میں سمجھتا ہوں کہ دسنوی صاحب کی یہ سفارش کہ اُردو لغات (ٹائپ) میں حروف علت بین الاقوامی صوتیاتی انجمن کے قائم کئے ہوئے استعمال کئے جائیں تو یہ ایک جدید ہی نہیں، ... آسان اور مفید تجویز بھی ہے کیونکہ لغت میں لفظ کی اعرابی صراحت کرتے وقت ہر ایک حرف (وہ صحیح ہو یا علت) الگ الگ لکھنے کی تجویز ہے؛ اس طرح:

تلیل　ق i ل i ل

قلم　ق ə ل ə م

علم　ع ə ل ə م

[1] یعنی یہ کہ دسنوی صاحب کی یہ تجویز صرف رومن رسم الخط پر ہی مبنی ہے، رومن رسم الخط اور اُردو رسم الخط، دونوں پر مبنی ہے۔

[2] یہ ایک نئی تجویز ہے۔

کتاب ک ا ت ا ب[3]

اس صورت کو اپنا لینے سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کمپوزنگ میں سطریں سیدھی رہیں گی، اور (اُردو اعراب لگانے کے مقابلے) ان میں گنجلک بھی نہیں پیدا ہوگا! کاغذ کی بھی بچت ہے، سطریں اونچی نیچی بھی نہیں ہوں گی، پھر یہ بھی ہے کہ ہم اُردو لغات میں لفظوں کے اعراب کی وضاحت میں جو طول طویل صورت اختیار کرتے رہے ہیں اُس سے بھی بچ جائیں گے، مثال کے طور پر:—

مدعا بضم میم و تشدید دال مفتوح (قاموس الاغلاط)

مہت بالضم و فتح دوم (بہار عجم)

اصطبل بکسر الف و سکون صاد و فتح طا و سکون با و لام (نور اللغات)

اسطرلاب بضم اول و ثالث و لام بالف کشیدہ بیائے ابجد زدہ (برہان قاطع)

اصلیت فت ا، سکن ص، کس ل، فت ی بشد (نمونہ لغات اُردو شائع کردہ اُردو ترقی بورڈ کراچی)[4]

اور پھر یہ بھی ہے کہ تمام ہی اُردو محققین صوتیات بین الاقوامی اعراب کو اپنے مضامین میں ذکر و فکر کے وقت عبارت میں لاتے ہیں اور خود گیان چند صاحب نے بھی (I.P.A) اور امریکی صوتی چارٹ سے لئے ہوئے کچھ اعراب کو اپنے مضمون میں دیا ہے، وہ یہ ہے:—

نمبر شمار	اُردو نام	اُردو علامت	صوتیاتی علامت
۱-	یائے معروف	ِی	i:
۲-	زیر معروف	ِ	i
۳-	یائے مجہول	ے	e
۴-	زیر مجہول	ٖ	E
۵-	یائے لین	َے	ɛ
۶-	زبر امالہ دار	ٚ	əe
۷-	زبر سادہ	َ	ʌ
۸-	الف ممدودہ	آ	a
۹-	واؤ لین	َو	ɔ
۱۰-	پیش مجہول	ٗ	ʊ
۱۱-	واؤ مجہول	او	o
۱۲-	پیش معروف	ُا	u
۱۳-	واؤ معروف	ُو	u:

میرا اس جدول کو یہاں دینے سے مطلب یہ تھا کہ دوسرے حضرات کے سوا، خود گیان چند صاحب بھی بین الاقوامی صوتی نشانات اور کچھ امریکی نشانات اپنے مضامین میں شامل کرکے

[3] اقتباس "اُردو ٹائپ میں املا کا مسئلہ، ایک نئی تجویز" مصنف: سید شہاب الدین دسنوی مطبوعہ "نوائے ادب" بمبئی، شمارہ جنوری سنہ ۱۹۶۲ء۔

[4] اقتباس: "اُردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ، ایک نئی تجویز" مصنف: سید شہاب الدین دسنوی۔ مطبوعہ نوائے ادب بمبئی۔ شمارہ جنوری سنہ ۱۹۶۲ء۔

اُردو اعراب کو ذہن نشین کرانے کی حد تک تو ہیں، لیکن لغات میں ان کے استعمال کے مخالف ہیں۔ آخر کیوں؟

یا تو یہ ہونا چاہیئے کہ ان اعراب و علامات کا اُردو صوتیاتی مضامین میں سرے سے ذکر اور استعمال ہی نہ ہو! اور جب ان کا ذکر از بس ضروری ہو گیا ہے (جیسا کہ ایسے مضامین میں کثرت سے دیکھنے میں آتا ہے) تو پھر ان کو بلا تکلف اپنا لینا چاہیئے، ورنہ ان کو بحث میں لائی ہوئی تمام کوششیں اکارت جائیں گی۔ اردو کا دامن تو ہمیشہ سے وسیع تر رہا ہے اس کا اس نے عملی طور سے بھی ثبوت دیا ہے اور اس پر کسی کا کوئی احتجاج بھی نہیں ہوا[1]!

یہ ایک نئی تجویز جو صرف اُردو لغت (ٹائپ) تک ہی محدود ہے، اور بس! پھر یہ بھی ہے کہ ان اعراب سے اردو کے صحیح املا کو سمجھنے کے سوا، اُردو داں طبقہ انگلش پڑھتے، لکھتے یا بولتے وقت صوت و تلفظ کے اعتبار سے از خود صحیح اور درست ہو گا۔ اس سے یہ ایک عظیم فائدہ کیا کچھ کم ہے؟ (دُرد آفریدی)

بےخود بدایونی

ہماری زبان مورخہ ۱۵ر دسمبر ۶۲ء میں جناب خاور صاحب جبلپوری نے جناب بیخود بدایونی کی سوانح حیات معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے چونکہ اس خاندان سے میرے روابط و ضوابط رہے ہیں اس لئے بےخود بدایونی کے حالات اپنی یادداشت سے سپرد قلم کرتا ہوں۔

نام عبدالحی تخلص بیخود، والد کا نام مولوی غلام رسول بدایونی، ولادت بمقام بدایوں بتاریخ ۷ محرم ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۷ ستمبر ۱۸۵۶ء، صدیقی النسل۔ مختلف اساتذہ سے فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی پہلے پہل مولانا حالی کو کلام دکھایا، ۱۶ برس کی عمر میں فکر معاش پیدا ہوئی۔ الہ آباد سے درجہ اوسط وکالت پاس کیا، بعد حصول سند وکالت مختلف بلاد کی سیر کی اور ۱۲۹۳ھ میں وکالت شروع کی اور اسی زمانہ میں رام پور جا کر فصیح الملک حضرت داغ کے تلامذہ میں داخل ہو گئے اور پھر سنبھل میں وکالت کرنے لگے اور وہاں سے ریاست سروہی میں جوڈیشیل آفیسر مقرر ہو کر تشریف لے گئے چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں۔ ؎

خصب گریہ اگر دیدۂ خونبار کریں
جو پہاڑی ہے سروہی میں وہ آب ہو جائے

آج سے قریب ستر اکہتر سال پہلے یعنی ۱۳۰۹ھ میں بعہدۂ فوجدار (ڈسٹرکٹ جج) تشریف لائے اور شادی کی جن کے بطن سے جناب مولوی رضا حسین صاحب بیدل پیدا ہوئے۔ اہلیہ اوّل کے انتقال کے بعد دوسری شادی اجمیر کی جن کے بطن سے دو لڑکیاں اور پانچ لڑکے پیدا ہوئے۔ اوّل ضیا حسین صاحب دوم مجتبیٰ حسین صاحب (یہ عالم طفلی میں فوت ہو گئے) سوم مرتضیٰ حسین صاحب (یہ سانپ کے کاٹنے سے غالباً ۱۹۲۹ء میں فوت ہوئے) چہارم مصطفیٰ حسین صاحب (یہ بھی پاکستان میں شاید کہیں مجسٹریٹی کے عہدے پر مامور ہیں) پانچویں اجتبیٰ حسین صاحب یہ ریاست جودھپور میں بعہدۂ سب انسپکٹر مامور تھے اور اب راجستھان بننے کے بعد جالور کی طرف کسی تھانے میں ہیں۔ لڑکیوں میں سے ایک لڑکی پاکستان ہے، دوسری ریاست بیکانیر میں ہے۔

راقم الحروف نے غالباً ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں جب اس کی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا خود بیخود صاحب کو دیکھا ہے اور سنا ہے صاحب موصوف نہایت نازک مزاج و نزاکت پسند تھے، ایسے ہی نازک خیال بھی تھے چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

دل دیا درد دیا درد میں لذت دی ہے ‖ تیرے اشنے کیا کیا مجھے دولت دی ہے

میرا ذاتی خیال ہے کہ حضرت بیخود کا انتقال ۱۹۱۶ء میں ہوا جس کی تحقیق جاری ہے آپ کے صاحبزادہ بیدل صاحب سے برسوں لطف صحبت رہا وہ اکثر اپنے والد مرحوم کا کلام پڑھا کرتے تھے جس میں سے مجھے یہ اشعار یاد ہیں۔

جب کہا اس سے کہ مرتے ہیں تو ہنس کر بولے ‖ زندگانی کا تو انجام یہی ہے مرجانا
مجھے تو جان ہے وہ بھرم آ دیا کہ نہ آؤ ‖ پتہ اجل ہی کو دے دو غریب خانہ کا
دل ہمیں عزیز ہے تجھے غم بھی عزیز ہے ‖ یہ نعمت خدا وہ بتوں کا دیا ہوا
تم اپنے ہاتھ سے تقریر دو زہے قسمت ‖ جناب خطا کریں تو ہمیں سزا دینا
بدوسے یوچھتے ہو تراد ل کہاں ہے اب ‖ ہاتھوں میرے آؤ تو کہدوں یہاں ہے اب

مرحوم راسخ العقیدہ شخص تھے، ایام محرم میں تو مجلس پڑھا کرتے تھے اور حضرت پیران پیر دستگیر سے خاص دلی عقیدت تھی۔ آپ نے بطور کرامات ایک ہیں کا قصہ نظم کیا ہے اور بحیثیت منشی بیچ اس ہیں کو بری کر دیا، اور خود کشی کی سزا دی۔ یہ مثنوی غالباً راقم الحروف کے کتب خانے میں تلاش سے مل سکتی ہے۔ آپ کا کلام طبع ہو چکا ہے۔ حمد و نعت کے میدان میں بھی اصناف شاعری کو نہیں چھوڑا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

مولا کے قد و زلف و دہن کی مثال ہے ‖ مطلب کھلا ہوا ہے الف لام میم کا
تیرے تیّم ہونے سے اب قدر بڑھ گئی ‖ پہلے نہ تھا یہ مرتبہ دُرِّ یتیم کا
.... ‖ خلت خلیل کی یہ بیضا کلیم کا

بیخود دیار یار سے اب دل اٹھایئے
چل کر طواف کیجے نبی کے حریم کا

آپ کے دیوان میں آپ کے خود نوشتہ حالات ہیں جن سے کافی مدد مل سکتی ہے میری نظر میں ان کا دیوان صرف ایک جگہ ہے جس کا مطالعہ کر کے کا میرے جناب خاور کی خاطر جمع کر لیا ہے۔ جناب وحید الدین صاحب بیخود دہلوی کے حالات جو گفتار بیخود میں درج ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ جناب داغ سے بر وقت وفات پوچھا گیا کہ آپ کا جانشین کون ہو تو فرمایا بیخود ہیں یعنی بابے خود دہلوی یا بے خود بدایونی۔ گو یہ عظمت جلیلہ حضرت بیخود دہلوی کے لئے مقدر تھی مگر اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ جناب بیخود کی قدر و قیمت جناب داغ کی نظر میں کیا تھی۔ اگر موجودہ حالات سے کچھ زیادہ وقفیت حاصل ہوئی تو انشاء اللہ پھر لکھوں گا۔

(بیکس جودھپوری)

---

[1] اس ذیلی تجویز کا مقصد یہ ہے کہ اُردو میں عربی، فارسی، ترکی، پرتگالی، ہندی، سنسکرت اور انگلش وغیرہ جیسی زبانوں کے الفاظ سمائے ہوئے اور اردو کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، اور ان کا بکثرت استعمال بھی۔ دُرد

(پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا)